حالی کے مقدمہ شعر و شاعری میں تنقیدی عناصر

الطاف حسین حالی کی شعر و شاعری پر مقدمہ میں کس طرح کے خیالات ملتے ہیں۔

حالی کے دیوان کا دیباچہ یا مقدمہ عرف عام میں مقدمۂ شعر و شاعری کے نام سے مشہور ہے۔ حالانکہ شعر و شاعری اس مقدمہ کا عنوان ہے اور مقدمہ اس کی نوعیت۔ لیکن لوگ عام طور پر ان دونوں کو ایک ساتھ استعمال کرتے ہیں اور "مقدمہ شعر و شاعری" کہتے ہیں۔

حالی ادب کے ان پیش روؤں میں ہیں جنھوں نے تمدنی حالات میں تغیر کا احساس کر کے شعر و ادب میں نئی راہیں نکالیں اور ایک نئے راستہ کی طرف لوگوں کو متوجہ کیا۔ شاعری میں وہ مولانا محمد حسین آزاد کے ساتھ نئے طرز کے مبلغ اور راہبر تھے۔ چونکہ ان کی جتنی قدیم طرز شاعری میں استادی ہو چکی تھی اس وجہ سے ان کا نئے شعرا میں شامل ہونا اور اس وقت سے کیف معلوم ہونے والی نئی شاعری میں لگ جانا نئی شاعری کے لئے اس وجہ سے بہت مفید ثابت ہوا کہ لوگ یہ اعتراض نہ کر سکے کہ جدید شاعری میں لگ جانا تو وہ لوگ کرتے ہیں جن کو پرانے طرز سخن میں کہنا نہیں آتا۔ نئی شاعری کا سلسلہ ۱۸۷۴ء سے باقاعدہ شروع ہوا تھا اور جب اس اصول کی اشاعت کرتے کرتے زندگی کے نئے تقاضوں کے ماتحت لوگوں کو بدل جانے کی تلقین کرتے کرتے بیس سال گزر گئے اور حالی کے دیوان کی ترتیب کا وقت آیا تو انھوں نے یہ بھی ضروری سمجھا کہ اس کی ابتدا میں شاعری کی اہمیت اور اس سے متعلق دوسرے مضامین پر کچھ لکھ دیا جائے تاکہ نئی شاعری کے رہنماؤں اور محرکوں کا مقصد سمجھ سکیں اور شاعری کو تفریح طبع کے علاوہ ایک ایسی بنیاد بنا دیں جو زندگی کو سدھارنے اور خیالات کو متاثر کرنے کا کام کرتا ہے۔ جس ماحول میں حالی زندگی گزار رہے تھے اس میں شاعری اپنے مقصد اور اپنی روح سے الگ ہو چکی تھی اور صرف تفریح یا قافیہ پیمائی کا ذریعہ رہ گئی تھی۔ اسی بنا پر حالی نے اپنے دیوان کے مقدمہ میں ان چیزوں کا جائزہ لینا چاہا جن سے شاعری شاعری ہوتی ہے۔ وہی شاعری جو تہذیب کا سرمایہ اور تمدن کی میراث ہوتی ہے۔

حالی نے جب اس عنوان پر قلم اٹھایا تو ان کو اس کی بھی ضرورت محسوس ہوئی کہ وہ اردو شاعری کے اہم اصناف کا جائزہ لیں اور ان کی خوبیاں اور خرابیاں لوگوں کو بتائیں۔ تاکہ اردو ادب کے شیدائیوں پر یہ معلوم ہو جائے کہ ان کے پاس کیا ہے اور کیا ہونا چاہیے۔

دوسرے حصے پر جب پہنچا تو خوش ہوا کہ چونکہ شعر پر جب وہ بحث زیادہ تفصیل سے کی گئی ہے۔ حالانکہ
یہ مقدمہ اتنا مبسوط ہو گیا کہ اسے ایک مستقل ایک کتاب کی حیثیت حاصل ہو گئی۔

مقدمہ شعر و شاعری کے دو حصے ہیں۔ پہلے حصے میں شعر و نفس شعر پر اظہار خیال ہے اور دوسرے حصے میں اردو شاعری کا جائزہ لیا ہے۔ مقدمے کے پہلے حصے کو لوگ اردو شاعری پر لکھے گئے [illegible] وہ جتنا [illegible] کے علاوہ ایسی ترتیب کا ہے جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان پر شاعری کی سماجی اہمیت سے زیادہ اسلام کے مذہبی جواز کا خیال سوار ہے۔ چنانچہ وہ ترتیب وار طور پر مذہب میں شاعری کا ذکر کرتے ہیں۔ وہ اس بحث میں پڑ جاتے ہیں کہ شعر کیا مذہبی حیثیت سے درست سمجھا گیا ہے؟ اور قرآن شریف میں جو آیات موزوں ہیں ان کو شعر کہا جا سکتا ہے یا نہیں۔ کہیں کہیں پر بعض موقعوں پر شاعری کی ضرورت اور اس کی تاثیر پر اظہار خیال کیا ہے۔ لیکن یہ اس مقدمے کا حصہ ہے کہ تمام پڑھنے والے کی نگاہ میں نہیں آتا۔

غدر کے بعد ادبیات میں جب ایک نئے دور کا آغاز ہوا تو آزاد نے "آب حیات" میں شاعری کی سماجی اہمیت تسلیم کی اور زندگی اور معاشرے کے مختلف اثرات کا اثر شعر پر ظاہر کیا۔ لیکن نفس شعر پر اظہار خیال ان کے دائرہ اثر سے باہر تھا۔ اسی لیے تفصیل سے پہلی دفعہ اس کا ذکر حالی کے مقدمہ میں ملتا ہے۔ اسی بنا پر بعض لوگ حالی کے اس مقدمہ کو اردو تنقید کی پہلی کتاب کہتے ہیں۔ ان کا مطلب اس سے یہ ہے کہ ایسی مبسوط اور جامع تنقیدی کتاب کی اولیت مشکل ہے جس میں نفس شعر اور اس کے مختلف پہلوؤں پر واضح طور پر بحث کی گئی ہے اس کے علاوہ شاعری کی سماجی اہمیت کو بھی ابھارا گیا ہے۔

"شعر و شاعری" سے پہلے جو تنقیدی تصانیف اردو میں موجود ہیں، ان کی تعداد کافی ہے ان میں شاعروں کے تذکرے ہیں۔ "تقابلی موازنے"، "تقریظیں اور شعراء کی غلطیاں"، شاعری معاشقے وغیرہ بیان کیے گئے ہیں۔ مگر تذکروں پر تنقید ہی زیادہ ہے۔ نیز ان کا تعلق کسی خاص شاعر یا کسی خاص شعر سے رہتا ہے۔ ایسا کم ہو کہ شاعری کی عمومی حیثیت سے برائی کی گئی ہو یا اس کے محاسن بیان کیے گئے ہوں۔ سوسائٹی پر اس کے مضر یا مفید اثرات نمایاں کیے گئے ہوں۔

حالی نے "مقدمہ" کے پہلے حصے میں شاعری کے مذہبی جواز کو چھوڑ کر ان کے معاشرتی پہلوؤں پر بحث کی جو ابتدائی سطور میں اسی بات کی غمازی ہے کہ شاعری ایک سماجی آرٹ ہے جس کا زندگی سے براہ راست تعلق ہے اور جس کے اثرات معاشرے اور تہذیب پر نمایاں ہوتے ہیں۔ انہوں نے افلاطون کے اس فلسفے کی مذمت کی جس میں اس نے شاعری کو سماج کے لئے ایک غیر مفید کام اور شاعروں کو تہذیبی ترقی اور ذہنی ارتقاء میں بیکار شے سمجھا ہے انہوں نے اسی بنا پر اچھی طرح سے لوگوں کو ذہن نشین کرانا چاہا ہے کہ شاعری کو محض تفریح کا

کا آلہ یا بیکاری کا شغل نہیں سمجھنا چاہئے۔ اس کی تائید میں مصنف نے اپنی مثالیں پیش کی ہیں جن میں شاعری نے سماج کی انقلابی کروٹوں میں اہم حصہ لیا ہے۔ یہ مثالیں صرف یورپ کی نہیں بلکہ ایشیائی ممالک کی بھی ہیں۔

جس زمانے میں اور جن حالات میں حالی یہ کتاب لکھ رہے تھے اس وقت سب سے اہم ضرورت یہ تھی کہ لوگوں کو بتایا جائے کہ شاعری بیکار چیز نہیں ہے۔ بلکہ یہ زندگی سے گہرا تعلق رکھتی ہے تاکہ یہ اصول ذہن نشین ہونے کے بعد لوگوں کو یہ بتایا جا سکے کہ اٹھارہویں صدی کی شاعری ان کی زندگی سے دور اور ان کے راستے سے الگ ہو گئی ہے۔ اس احساس کے بعد شاعری کو عملی زندگی کی تعبیر بنانے کی مہم شروع کی جا سکے اور اس خاکستر سے نیا جہان تعمیر کرنے میں اس سے بھی مدد مل سکے۔

حالی نے سب سے زیادہ زور اس پر دیا کہ شاعری ایک سماجی آلہ ہے جو سماج کو مختلف صورتوں سے متاثر کرتا ہے۔ ساتھ ہی وہ اپنے دور کا آئینہ بھی ہوتا ہے۔ یعنی قومیں جن حالات سے دوچار ہوتی رہتی ہیں اور جن خیالات میں اس کے اکثر لوگ پڑے رہتے ہیں ان کا اثر شاعری میں ظاہر ہوتا ہے۔ اس طرح دونوں ایک دوسرے کا اثر قبول کرتے ہیں۔ اگر کسی زمانے میں عیش پرستانہ جذبات کی فراوانی ہو جاتی ہے تو اس زمانے کے ادب میں بھی ویسے ہی خصائص پیدا ہو جاتے ہیں۔ شاعری کو خلا کی پیداوار نہیں سمجھنا چاہئے۔ ظاہر ہے ایسے میں ہر دور کی شاعری کو سمجھنے کیلئے یہ بھی ضروری ہے کہ اس وقت کے حالات سے واقفیت ہو اور اس ماحول کے تناظر (۱)
میں شاعری کو رکھ کر دیکھا جائے کہ وہ کس طرح ابھرتی ہے۔

میر کی شاعری میں جو درد و غم تھا وہ ان کا ذاتی تو ہے ہی لیکن اس کے ساتھ وہ اس زمانے کا عکس بھی ہے۔ جب حکومت زوال کی طرف جا رہی تھی۔ ماحول میں انتشار اور افراد کی حالت خراب تھی۔ دہلی حکومت کا انتظام بگڑا ہوا تھا۔ ایک کے بعد ایک حملہ آور آتا تھا اور دہلی کو لوٹ کر جاتا تھا۔ ان حالات میں جہاں ایک میر، سوز، انعام اللہ خاں یقین اور قائم کے کلام میں رنج و غم کے بادل پیدا کر دئے، ملک کی کج رفتاری کی شکایتیں کیں وہیں دوسری طرف اس نے صوفیانہ خیالات کی بھی زیادتی کر ڈالی۔ اردو غزل میں میر تقی اور میر درد خصوصیت سے تصوف کو نمایاں کرنے والے نظر آتے ہیں۔ اس لئے کہ وہ ایسے حالات میں اپنے ماحول کو بھول جانا ہی بہتر سمجھتے تھے۔ عشق حقیقی کی لگن میں مست اس دنیا کی زندگی کو خواب اور افسانہ ٹھہرا کر وہ ایک نئے دور کے بنیاد گزاروں میں شامل ہو گئے۔ ایک نئی طرز کے ذہنی سکون حاصل کرتے نظر آئے اور دنیا کی تکلیفوں کو چند روزہ کہہ کر خوشی سے گوارا کیا جا سکتا ہے۔ یہ وہ پس منظر ہے جس میں درد، میر، یقین، سوز وغیرہ کی شاعری کو صحیح طور پر سمجھا جا سکتا ہے۔

حالی کا کہنا ہے اسی طرح ہر زمانے میں اور ہر دور میں شاعری کو سمجھنا چاہئے اور یہ نہیں سوچنا چاہئے کہ فلاں شاعر کو کسی کی زندگی سے کیا تعلق۔ اطمینان سے آرام سے کرسی پر بیٹھ کر شاعر تو محبت کی جھوٹی داستان نظم کر دیتا ہے۔ اس غریب کو اس کی اصلیت سے کیا واسطہ۔ جدید تنقید اسی طرح کے خیالات کو دل سے نکال دینے کو کہتی ہے۔ اگر شاعری نے شاعری سے لوگوں اسے حقیقی جذبات و احساسات کا ترجمان ہونا چاہئے۔ نہیں تو وہ شاعر اپنا ہی نہیں، دوسروں کا بھی وقت ضائع کرتا ہے اور بہت سا کاغذ اور روشنائی بھی۔ وہ دنیا کیلئے بیکار محض ہے

جو لوگ شاعری میں حقیقی جذبات بیان نہیں کرتے ان کی شاعری بیکار ہے اور اس سے قوم و ملک کو کوئی فائدہ نہیں پہنچتا۔

ایسے میں ادب کا اخلاق سے تعلق ایک بڑا اور اہم سوالیہ نشان بن کر ابھرتا ہے۔ کیا ادب کو اخلاق کا آلہ ہونا چاہئے جیسا کہ لوگ کہتے رہتے ہیں؟ یعنی شاعری میں لوگوں کو یہ تعلیم دینا چاہئے کہ وہ نیک کام کریں۔ اچھی طرح رہیں۔ بلا شبہ اچھی شاعری زندگی کو بہتر بنانے اور اس کو سنوارنے کا کام کرتی ہے۔ لیکن شاعر کا کام یہ نہیں کہ وہ ناصح مشفق اور کوتوال شہر کی طرح یہ فرمائے کہ ایسا کرو اور ایسا نہ کرو۔ پھر ایک طبقہ عورت کے ذکر کو ہی اخلاق خراب ہونے کا ذمہ دار سمجھتا ہے اور جان بوجھ کر ایک ایسی حقیقت سے انکار کرتا ہے جو زندگی کا لازمی جزو ہی نہیں بلکہ اس کی تخلیق اور تکمیل میں بڑا ذمہ دار اور اہم رول ادا کرتی ہے۔ عورت کے ذکر سے اجتناب یا اس کے سائے سے گریز کرنے کی تعلیم دینا نئی نسل کے ذہنوں کو غیر فطری تصورات سے دوچار کرنا ہے۔ جو اخلاق کی خرابی کے ذمہ دار ہوتے ہیں۔ اسی وجہ سے حتی الوسع اردو کے شاعر اور فنکار بھی تمام دوسرے ممالک کی طرح اپنے فن کا محور بیشتر عورت کو بناتے ہیں۔ اس کے حسن کی داستان اور اس کے عشق کے فسانے ان کا موضوع ہیں۔ القرآن نے بار بار اس حقیقت پر زور دیا ہے کہ حسن اور عشق کا تذکرہ فطری اور حقیقی ہے۔ اس کے ساتھ گندگی کا تصور اسی وجہ سے پیدا ہو گیا ہے کہ ہم سالہا سال اس تذکرے پر خاموش رہتے اور اس سے بظاہر پرہیز کرتے رہے ہیں۔ جتنا زیادہ ہم نے عورت کے ذکر بالخصوص بیباک ذکر سے پرہیز کیا ہے اتنا ہی وہ ہماری نئی نسلوں پر سوار ہوتی گئی ہے۔ اس نے غیر فطری طور پر ہمارے تصورات کو ناآسودہ کر رکھا ہے۔ اس طرح یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کر لینی چاہئے کہ ادب میں اخلاق کا کیا تصور ہے۔

آرٹ اور فن کے نقطۂ نظر سے بعض مجسم برہنہ تصویر جو بعض قدر کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہیں ان کو کوئی قابل الزام نہیں ٹھہراتا۔ آرٹ کا مقصد زندگی کی تمام فطری خواہشوں اور جبلتوں کی صحت مندانہ پرورش ہی ہے۔ فن کار کا کام یہی ہے کہ زندگی کو اس کی تمام رنگا رنگی کے ساتھ ہی پیش کرے۔ اس کی پیش کش میں صحت مندانہ ترقی کا نقطۂ نظر لازمی ہے۔ جب فنکار اپنے موضوع میں یہ نقطۂ نظر برقرار رکھتا ہے اور اس سے لذت پرستی نہیں ٹپکتی تب تک وہ فن کار رہتا ہے جہاں اس میں لذت پرستی کا عنصر غالب آتا ہے یا ان کے ذکر سے زبان یا ذہنی چٹخارہ مقصود ہے تو وہ ادب نہیں رہتا، آرٹ نہیں رہتا بلکہ فحاشی یا عریانی ہو جاتی ہے۔

ایک سوال اور ذہن میں ابھرتا ہے جس کی وضاحت جدید تنقید کی روشنی میں ضروری ہو جاتی ہے۔ کیونکہ آئے دن شاعری اور اس کے مقاصد پر بحثیں بڑھتی جا رہی ہیں اور اسی وجہ سے اس کے بعض اہم پہلوؤں کا ذہن میں رہنا ضروری ہے۔ ہم بار بار اس بات پر زور دیتے ہیں کہ ادب کو زندگی کی اصلاح میں مدد دینا چاہئے اور بہتر زندگی گزارنے کے لئے اس سے مدد ملتی رہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا ادب پروپیگنڈہ ہے؟ کیا ایک لطیف شعر یا سحر کار تصویر ہونے

کی بجائے اس کو انقلاب کا نعرہ ہونا چاہئے؟ یا کوئی Five year Plan یا کوئی اعلان نامہ؟ کسی نظم میں یہ بات بیان کی جائے تو وہ شاعری تو ہو گئی نہیں۔ کیونکہ پیرایۂ تصور اشکوں کا اعتبار ہے تو ہم یہی سمجھتے آئے ہیں کہ شاعری میں صرف محبت کی بات بیان کی جانی چاہئے وہ بھی زیادہ تر کسی انسان کی۔

جو چیز شاعری کو شاعری بناتی ہے وہ اس کا موضوع نہیں بلکہ اس کا فن ہے۔ دوسرے الفاظ میں یہ کہ شاعری میں یہ دیکھنا چاہئے کہ موضوع کس طرح پیش کیا گیا ہے؟ خواہ وہ کسی عورت کے تعلق سے ہو یا دو ملکوں کی لڑائی ہو یا چور بازاری کا مسئلہ۔ یہ ساری چیزیں شاعری ہو سکتی ہیں اور نہیں بھی۔ اردو ادب میں بہت سی ایسی نظمیں ہیں جن میں حسین عورتوں کا ذکر ہے، دلفریب مرغزاروں کا ذکر ہے، لیکن اس کے باوجود وہ اچھی اور کامیاب نظمیں نہیں ہیں۔ اس کا ثبوت دوسری طرح بھی دیا جا سکتا ہے کہ ہمارے شاعر ابتدا سے لے کر انیسویں صدی تک اور اس کے بعد بھی زیادہ تر محبت کے نغمے گاتے آئے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود ان کے یہاں تمام اشعار اچھے نہیں اور تمام یا بیشتر اول درجے کے اشعار قرار نہیں دئیے جا سکتے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بات ایک ہی ہونے کے باوجود شاعر فنکارانہ انداز سے موضوع کو پیش کر دیتا ہے اس کی شاعری صحیح معنوں میں شاعری ہو جاتی ہے۔ نہیں تو سب سے نچلے درجے میں شمار کئے جاتے ہیں اور ان کے اشعار مشاعرے کی واہ واہ کے بعد گمنامی کے دھندلکے میں گم ہو جاتے ہیں۔

اس خیال کے پیش نظر اب یہ دیکھنا ہے کہ اگر ادب 'ادب' رہتے ہوئے کسی خیال کا پرچار بھی کرتا ہے اور اس کا تخیل کسی خاص نظریات میں رچ بس کر پڑھنے والے کو اس کی طرف لے جاتا ہے تو ادب کا کام ہی یہی ہے۔ وہ زندگی کو سنوارنے اور اسے بہتر بنانے کے طریقے سمجھاتا ہی ہے۔ اگر شاعر کے ۷
نزدیک کوئی خاص نظام یا معاشرہ دنیا کیلئے بہتر ہے اور اسی میں دنیا' انسانیت کی فلاح و بہبود شامل ہے تو اس کا یہ کام ہے کہ وہ پڑھنے والے کو اس کی طرف راغب کرے۔ لیکن جہاں تک اس کی شاعری 'شاعری' رہتی ہے وہاں تک تو ورنہ پھر شاعری باقی نہیں رہتی اور صرف نظام کا ڈھنڈورا بن کر رہ جاتی ہے۔ یہاں ادب کے دائرہ سے نکل جاتی ہے۔ اچھی شاعری کو اپنے اندر جذبات کو متاثر کرنے اور انسان کی جمالیاتی حس کی تسکین پہنچانے کے قابل ہونا چاہئے۔ اس لئے اگر کوئی نظم یا شعر ہمارے جذبات کو متحرک کرتا ہے، ہمارے احساس کو مطمئن کرتا ہے تو وہ شعر ہے چاہے اس میں انسان کا بیان ہو یا گھوڑے کا ذکر ہو یا کسی بیل گاڑی کا۔ اس معیار پر یہ فیصلہ کرنا چاہئے کہ وہ کون سی نظم شاعری ہے اور کون سی پروپگنڈہ۔ نہ تو روس میں لکھی جانے والی تمام نظم ترقی پسند شاعری ہے اور نہ دوپٹہ اور آنچلوں اور کاجلوں کے ذکر والے تمام اشعار رجعت پسند ہیں۔

مجروح کا شعر ملاحظہ ہو —

مری نگاہ میں ہے ارضِ ماسکو مجروح
وہ سرزمیں کہ ستارے جسے سلام کریں۔

تو یہ شعر پروپگنڈہ ہی رہے گا، ادب نہیں ہو سکتا۔

فیض کا شعر ہے —

آج پھر حسنِ دلآرا کی وہی دھج ہوگی
وہی خوابیدہ سی آنکھیں وہی کاجل کی لکیر
رنگِ رخسار پہ وہ غازے کا ہلکا سا غبار
صندلی ہاتھ پہ ہلکی سی حنا کی تحریر

اردو غزلوں کا مزاج مبالغہ میں اسے کچلنے کی حد تک ہو گیا ہے۔ لاغری کا ذکر ہے تو اس حد تک کہ آدمی مر گیا آدمی نے موت کے ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملتا اور دیدہ سے نظر آتا ہے۔

تشبیہات و استعارات کا دائرہ بھی اردو غزل میں محدود ہو گیا ہے۔ جو تشبیہات پہلے سے استعمال ہوتی ہیں ان کا دہرانا بے کیفی پیدا کرتا ہے۔

غزل کی یہ برائیاں جو حالی نے بیان کی ہیں اصل میں وہ غزل کی صنفی برائیاں نہیں ہیں بلکہ ان شعرا کی ہیں جو غزل کہنے کی صلاحیت خود میں نہیں رکھتے اور نقالی کرتے ہیں۔ اسی وجہ سے شاعری میں جدت، تنوع اور اصلیت نہیں رہ گئی اور وہ تمام عیوب بن گئے ہیں جن کا ذکر حالی نے کیا ہے۔ جب یہی علامتیں فنکاری اور خوبی سے استعمال ہوتی ہیں تو اپنے اندر معنی کی ایک وسیع دنیا رکھتی ہیں۔

بقول میر —

پتہ پتہ بوٹا بوٹا حال ہمارا جانے ہے
جانے نہ جانے گل ہی نہ جانے باغ تو سارا جانے ہے

یا اقبال کو دیکھیں —

بھری بزم میں راز کی بات کہہ دی
بڑا بے ادب ہوں سزا چاہتا ہوں

فراق — VII

کچھ قفس کی تیلیوں سے چھن رہا ہے نور سا
کچھ فضا کچھ حسرت پرواز کی باتیں کرو!

ان اشعار میں کسی پرندے یا کسی گلاب کے پھول یا کسی مشاعرے کا ذکر نہیں۔ بلکہ ان علامتوں کے استعمال سے شاعر نے ایک وسیع مضمون کو مختصر الفاظ میں ادا کر دیا ہے۔ جس کی وجہ سے بیان میں رمز و اشاریت بھی باقی ہے اور مفہوم بھی ادا ہو گیا ہے۔ غزل میں ایسے کتنے ہی اشعار ہیں ساتھ ہی ایسے بھی ہیں جن میں شاعروں نے علامتوں کو غیر مفید طریقہ سے استعمال کیا ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شاعری بے جان اور بے کیف ہو کر رہ گئی۔ جب اس طرح بعض مضامین میں دوسروں کی نقل میں بغیر محسوس کئے ہوئے بیان کر دیئے جاتے تو ان کو رسمی اور تقلیدی کہتے ہیں۔

الغرض مقدمہ شعر و شاعری کے مختلف مباحث اور موضوعات کی روشنی میں یہ بات سامنے آتی ہے کہ حالی غزل کو خصوصی طور پر ایسے عناصر سے آزاد کرانا چاہتے تھے جو محض رسمی تھے۔ غزل کی اصلاح کے سلسلے میں حالی کے خیالات بہت واضح اور ہر شعوری طرز نگارش کی نمائندگی کرتے ہیں۔

حالی نہ صرف اردو تنقید کے بانی ہی نہیں بلکہ ترقی پسندانہ تنقیدی فکر کو ایک نہایت اہم موڑ دیا ہے۔ اس کے علاوہ ایک نئے اور اہم نظریاتی شعور سے بھی آشنا کیا۔

تو یہ جمالیاتی کشش کی وجہ سے ادب کا احیائے پارہ قرار پائے گا۔

حالی نے شعر و شاعری کے دوسرے حصے میں اردو کے اصناف سخن کا جائزہ لیا ہے۔ سب سے زیادہ جگہ انھوں نے "غزل" کو دی ہے اور سب سے زیادہ تعریف "مرثیہ" کی کی ہے۔ غزل کے سلسلے میں حالی نے یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ موجودہ غزل گوئی کس حد تک غیر فطری ہو چکی ہے۔ وہ شاعری جس کو ان مذکورہ شرائط پر پورا اترنا چاہئے، جن کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ کس طرح محض قافیہ پیمائی اور مبالغہ آرائی کی نذر ہوتی جا رہی ہے۔ بیشتر شاعر اپنے جذبات و احساسات کا ذکر شاعری میں کرنے کی بجائے رسمی اور روایتی طور پر شعر کہنے لگے ہیں۔ ان کے یہاں نہ کوئی واضح محبوب ہوتا ہے اور نہ واقعی اس کے حسن کی کرشمہ سازیاں، بلکہ جنون، صحرا، گلشن، صیاد اور قفس کے محدود الفاظ ہیں جن کو وہ گھما پھرا کر نظم کرتے ہیں اور اسی کو جان شاعری سمجھتے ہیں۔

ایک طرف دنیا میں صنعتی نظام اور اس کے اثر سے متوسط طبقے کے مسائل ابھرتے جا رہے ہیں، اور دوسری طرف ہندوستان پر انگریزی سامراج کی گرفت اور زیادہ مضبوط ہوتی جا رہی ہے۔ قومی کردار میں جو بلندی، خودداری اور عالی اوصاف و حوصلگی موجود تھی وہ غلامی کی چکی میں پس کر ختم ہوتی جا رہی ہے جن لوگوں کے پاس باپ دادا کی چھوڑی ہوئی دولت موجود ہے وہ اس کا استعمال کا صحیح طریقہ نہیں جانتے اور عیش پرستی میں اس کو تباہ کر رہے ہیں۔ شاعری اوّل
کے مقاصد کا تقاضہ تھا کہ وہ انھیں ادب میں شامل کرتی۔ بیشتر شعراء اس وقت ایک خیالی محبوب کی موہوم کمر کی تلاش میں سرگرداں ہیں اور اس کا احساس نہیں کرتے ان کی ساری عزت بھی مٹی میں ملتی جا رہی ہے۔ شخصیت کے مسخ ہونے کا احساس نہیں اور اس کا ثبوت اس سے بڑھ کر اور کیا ہوتا کہ اپنے فعل کو وہ عین حیات جانتے تھے اور جو لوگ نئی شاعری کا نام لے رہے تھے الٹا ان کو شعریت سے بیگانہ اور شاعری سے ناواقف سمجھتے تھے۔ ان کی مثال تو اس کنویں کے مینڈک سے بھی کچھ آگے تھی جو سمندر کی پرشور موجوں سے یہ سمجھ کر ہوشیار نہیں ہوتا کہ جب چاہیں گے ایک جست میں دوسرے کنارے پر پہنچ جائیں گے۔ حالی نے ایسے ہی مسخ شدہ ذہنوں پر اپنے مقدمہ سے ضرب لگائی اور غزل کے مطالب کو اس طرح سے گنوایا ــــــ

1 اردو غزل تقلیدی ہو گئی ہے۔ اس میں شاعر اب اپنے احساسات بیان نہیں کرتا بلکہ جس طرح کے خیالات اس سے پہلے کے شعراء لکھتے آئے ہیں انھیں کی تقلید کرتا ہے۔

دوم اب اردو غزل میں قفس، آشیانہ، صیاد، اور جلاد، قاتل، تربت، تیغ، بہار، رقیب، ناصح کی علامات ہیں اور نہ ان سے کوئی گہرے معنی لئے جاتے ہیں۔ دراصل بعد والی نسل ان کے معانی اور مروج سے قطعاً بیگانہ تھی اور ادنیٰ درجے کی ذہنی صلاحیتوں کو ان کے لفظی معنوں میں استعمال کرنے لگے تھے۔ اس طرح جو اساتذہ غزل گویوں کی بڑی معنویت والے اشعار تھے، معدوم ہوتے گئے۔

سوم اردو غزل میں جذبات و بیانات مشاہدے اور اصلیت پر مبنی نہیں بلکہ ان کا انداز رسمی اور روایتی ہو گیا ہے۔

بلکہ وہ ایک عہد آفریں شخصیت کے ادیب تھے اور ادبی تنقید کی دنیا میں ان کی آواز ایک عصر آفریں آواز تھی۔

حالی کی بانیانہ اہمیت کے احساس کے ساتھ دو باتوں کا ذہن میں رکھنا بہت ضروری ہے اول یہ کہ وہ اپنی تنقیدی فکر و نظر کے عمرانی میلان، سائنٹفک انداز اور بلند دانشورانہ معیار، وسعت اور گہرائی کی بنا پر آج بھی ہم عصر نقادوں میں واضح طور پر ممتاز اور افضل نظر آتے ہیں۔

دوسری بات یہ کہ گو حالی کے بعد اردو تنقید کا دائرہ بہت وسیع ہوا ہے اور وسعتی اعتبار سے نہیں تو مقدار کے لحاظ سے یقیناً ہمارا تنقیدی سرمایہ وسیع ہوا ہے۔ حالی کی تنقید کا گراں بار وزن و اعتبار مسلم ہی ہے اور آج تک منفرد و بے مثال ہے۔ مقدمہ شعر و شاعری اردو تنقید کی حیثیت سے اپنے وجود کے بعد کے تمام تنقیدی کارناموں پر فائق ہے۔ تنقید کے میدان میں ایک ستارۂ منور ہے اور ضیاپاشی ہے۔!

Dr. FERZANA ASLAM
PROFESSOR & HEAD
DEPT OF URDU
Sri Arvind Mahila College
Kazipur - PATNA 800004
Mob: 9304690111 (ferzanaaslam8@gmail.com)

For
B.A. (H) II & III